مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، انڈیا

# ملت کو درپیش امتحان حسن تدبیر یا وقتی جذبات؟

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے، ایک یہود، دوسرے منافقین، یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی، اور منافقین بغلی دشمن تھے، جو ہمیشہ در پردہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچاتے تھے، اور کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، عبداللہ ابن ابی ان کا سردار تھا، ابتداءً اس شخص کا نفاق انصار پر ظاہر نہیں تھا، اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے، مدینہ میں اس شخص کو پیغمبر اسلام ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا، بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، مگر اسلام کے بعد عبداللہ ابن ابی کا خواب پورا نہ ہوسکا، غالباً اس لئے بھی عبداللہ ابن ابی کے سینے میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف آتش غضب سلگتی رہتی تھی۔

آپ ﷺ اپنے رفقاء ''مہاجرین اور انصار'' کے ساتھ ایک مہم پر نکلے اس میں عبداللہ ابن ابی بھی شامل تھا، ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا، اور پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کے غلام اور ایک انصاری صحابی کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، بات آگے بڑھی غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے آواز دی، اور انصاری نے انصار کو پکارا، اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخصوں کا نہ رہا، بلکہ دو جماعتوں (انصار اور مہاجرین) کا اختلاف بن گیا، آپ ﷺ نے دونوں ہی کی فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا، لیکن عبداللہ ابن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا اس نے اس کو مہاجرین وانصار کے درمیان گروپ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لئے آئی کہ تم نے محمد (ﷺ) اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ ہماری مثال عربی زبان کے اس محاورے کی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو تا کہ وہ تمہیں کو کھا جائے ''سمن کلبک یاکلک'' پھر یہ بھی کہا کہ مدینہ پہونچ کر جو باعزت لوگ ہیں وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ ابن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی، ایک کم عمر انصاری صحابی حضرت زید ابن خالد جہنیؓ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی، اور جذبہ ایمان کے تحت رسول اللہ ﷺ سے صحیح صورت حال عرض کردی، حضرت عمرؓ پر جوش حق کا غلبہ رہتا تھا، اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہ تھا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو

لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرا رہے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے براہ راست عبداللہ ابن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی' اسنے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی' انصار میں سے اکابر اور سربرآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید تو بچے ہیں' ان کی بات کا کیا اعتبار؟ مگر خود وحی الہیٰ سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی' بہر حال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہوگیا' اور بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ ﷺ نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی' اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا' آپ ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے' لیکن خلاف معمول آپ پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے' اور اگلے دن دوپہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوئے' چلچلاتی ہوئی دھوپ گرم ریت بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا' اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہوگئی تھی اس کا اثر بھی جاتا رہا' دراصل یہی مصلحت تھی' جس کے پیش نظر آپ ﷺ نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا تھا' کہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں!

پھر ایک عرصہ کے بعد جب عبداللہ ابن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آ گیا' حضرات انصار کو بھی اس کا خوب اندازہ ہوگیا' تو عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے جو مخلص مسلمان تھے' اور ان کا نام بھی عبداللہ تھا' آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا' کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرانے والے ہیں' اور واقعتاً وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں' لیکن مجھے حکم فرمایئے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں' آپؐ نے اس سے منع فرمایا' اور حضرت عمرؓ کو بلا کر صورت حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہو سکتے تھے' اور آج صورت حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ اس کے نفاق اور در پردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں' اور خود اس کا لڑکا اس کے قتل کے لئے تیار ہے' حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی اس دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) کی رائے میں برکت رکھی ہے' بارک اللہ فی رای رسولہ"

یہ ایک مثال ہے حسن تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی! اسی کو قرآن مجید نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے' صبر کے معنی بزدلی اور پسپائی کے نہیں ہیں' بلکہ صبر سے مراد حسن تدبیر اور کسی اقدام کے لئے صحیح موقع و محل کا انتخاب کرنے کے ہیں' صبر یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپکو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے اس لئے کہ اشتعال اور غیض و غضب کی حالت میں انسان کی قوت فیصلہ کم یا ختم ہو جاتی ہے' اور فراست و دانشمندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے' اسی لئے آپ نے غصے کی حالت میں کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے

سے منع فرمایا ہے "لایقضی القاضی وھو غضبان" کیونکہ غصے کی حالت میں آدمی معاملے کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے انفرادی اور شخصی معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ حالت میں اہم فیصلے کرے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قومی اور اجتماعی مسائل میں ہم اشتعال اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان سنگین بھی ہوگا، دور رس بھی اور وسیع بھی۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیات طیبہ اس طرز عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے، جنگ کی حالت ہو، یا صلح کی، ہمیشہ آپ ﷺ نے خوش تدبیری کو وقتی جذبات پر غالب رکھا ہے، صلح حدیبیہ ہی کو دیکھئے بظاہر یہ صلح الف سے یا تک مسلمانوں کی امنگوں کے خلاف تھی، صلح نامہ لکھتے ہوئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا گیا اہل مکہ کے نمائندے نے اس کو قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر "باسمک اللھم" لکھنا پڑے گا، آپ ﷺ نے اسے مان لیا، پھر صلح کے فریق کی حیثیت سے آپ کا اسم گرامی "محمد رسول اللہ" لکھا گیا، دوسرے فریق نے "رسول اللہ" کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ ﷺ اس پر بھی تیار ہو گئے، حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اس کلمہ حق کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے خود محو فرما دیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے اور مدینہ سے جو مرتد ہو کر مکہ آئے، اسے واپس نہ کیا جائے، یہ بالکل امتیاز پر مبنی دفعہ تھی، یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام کریں، نیز نیام میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار پاس نہ رکھیں، یہ ساری باتیں عربوں کی روایات کے سراسر خلاف تھیں، حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی اپنے تحفظ کیلئے ہتھیار کے لئے ہتھیار رکھنا یہ بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جا رہے تھے، لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ ﷺ نے منظور فرمایا، اکثر صحابہ کرام کو یہ صلح بہت ناگوار خاطر تھی، حضرت عمرؓ سے تو برداشت نہ ہو سکا، اور انہوں نے آپ ﷺ سے فرط جذبات میں کچھ ایسے سوالات کر لئے کہ ہمیشہ اس پر پشیمان رہتے تھے، جب آپ ﷺ نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے لوگ اس طرح ایک دوسرے کے بال مونڈ رہے تھے کہ گویا سر کاٹ ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اسی صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی، "فتح مبین" قرار دیا (فتح ۱) دراصل آپ ﷺ کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں ہیں، ہر صبح و شام خوف کی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مکہ و معتدل فضاء میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا ہے، غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہیں، پھر اس خوف و دہشت کی فضا میں کھل کر دعوت اسلام کا کام بھی نہیں ہو سکتا تھا، آپ ﷺ کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے، وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی زیر کرے گی اور جن لوگوں کو میدان

جنگ میں فتح نہیں کیا جاسکا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات انکے قلوب واذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ کے رفقاء کم بیش چودہ سو تھے، اس واقعہ کے صرف دو سال بعد مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے اور فتح مکہ کے دو سال بعد جب آپ ﷺ نے حج فرمایا، تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، غرض آغاز نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ تھی، اور اگلے چار سال میں ان کی تعداد یقیناً سوا ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی، جن میں سوا لاکھ کے قریب تو خود آپ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دی تھی۔

آپ ﷺ کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالات سے گزر رہے ہوں وہ سیاسی اور افرادی مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اس وقت خصوصا اور ہر حال میں عموماً سماجی اور ملکی فضاء کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں، جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور نقصان دہ غیظ وغضب پر صبر اور خوش کشی کے مترادف ہو اور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعبیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوجائے اور ہماری ترقی معکوس ہوجائے، یاد رکھئے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہوجانا فرقہ پرستوں کی سب سے بڑی کامیابی اور حسن تدبیر کے ساتھ ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنا، فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بظاہر ہزیمت اور حقیقت میں فتح مبین!!

---

(بقیہ صفحہ ۴۰ سے) دارالعلوم کی تعمیر وترقی میں حقانی خاندان کی خواتین اور خصوصاً مرحومہ کا حصہ

کو پکڑ پکڑ کر اور گھیر گھیر کر انٹرویوز لیتے رہے، کرید کرید کر اور کھرچ کھرچ کر تحقیقات کرتے رہے، حضرت مولانا سمیع الحق صاحب نے اخلاص وللّٰہیت، حق وصداقت، جذبہ جہاد سے سرشار، حکمت وتدبیر سے معمور اور اسلام کے پیغام برحق سے پُرنور مفصل جوابات دے دے کر دنیا بھر کے جبر واستبداد کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کردیا۔ عالمی میڈیا کے رپورٹروں نے یہ انٹرویوز پوری دنیا میں نشر کئے اور اب تک نشر کئے جارہے ہیں اور یہ معرکہ حق ان شاء اللہ تاقیامت گونجتا رہے گا۔ یہ سینکڑوں ہزاروں مغربی لوگ جو آئے، سینکڑوں انٹرویوز کا ریکارڈ بھی رکھا گیا۔ اس میں سے کچھ بعض انٹرویو کتابی شکل میں مولانا سمیع الحق کے تجویز کردہ نام ''معرکہ صلیب وطالبان'' کے نام سے مرتب ہورہے ہیں۔ گزشتہ چار پانچ روز سے ان تاریخی انٹرویوز کے ضبط وترتیب، تدوین اور ترتیب واشاعت کے کام میں مگن ہوں، بس یہی دھن ہے، یہی فکر اور یہی ہدف۔ اس لئے آج دماغ بھی حاضر نہیں ہورہا، چند بے تکی سی باتیں عرض کردی ہیں، دعا فرماتے رہیے گا کہ اللہ کریم مرحومہ کو جنت الفردوس عطا فرماوے اور ''معرکہ صلیب وطالبان'' کو شایان شان طریقے سے مرتب اور طبع کرنے کی توفیق عطا فرماوے اسطرح یہ ایک عظیم تاریخی دستاویز بھی مرحومہ ومغفورہ کیلئے عظیم صدقہ جاریہ بنے گا۔